بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قوموں کی تعمیر
فکر سے ہوتی ہے ہنگاموں سے نہیں!

۶۹ - ۱۹۶۸ء میں اس بدنصیب ملک نے ہنگاموں کا سیلاب دیکھا۔ جگہ جگہ مظاہرے ہوئے۔ فسادات برپا کئے گئے۔ لوٹ مار، توڑ پھوڑ اور آتش زنی کی وارداتیں ہوئیں۔ یوں نظر آتا تھا جیسے ساری قوم جذبات کے شعلوں کی لپیٹ میں آ گئی ہے۔ اس کے بعد فضا میں قدرے سکون پیدا ہوا تو پرویز صاحب نے، طلوع اسلام کنونشن منعقدہ اکتوبر ۱۹۷۰ء میں ایک نہایت بلیغ، بصیرت افروز اور فکر انگیز خطاب پیش کیا جس نے ملک کے اربابِ دانش و بینش کو بے حد متاثر کیا۔ یہ خطاب طلوع اسلام میں بھی شائع ہوا، اور اس کا الگ پمفلٹ بھی چھاپا اور ملک میں عام تقسیم کیا گیا۔

اب پھر مختلف گوشوں سے تقاضے موصول ہوئے کہ اس خطاب کو دوبارہ شائع کیا جائے۔ ان تقاضوں اور اس خطاب کی اہمیت کے پیشِ نظر اسے دوبارہ شائع کیا جاتا ہے۔

(طلوع اسلام)

☆☆☆☆☆☆☆

خطاب

صدرِ گرامی قدر و عزیزانِ محترم۔ سلام و رحمت!

حیوان اور انسان میں ایک (اور میرے نزدیک سب سے اہم بنیادی) فرق یہ

ہے کہ انسان کو عقل وفکر کی صلاحیتوں سے نوازا گیا ہے۔ حیوان کے ہر عمل کا جذبہ ٔمحرکہ' جبلی تقاضا۔۔۔ (Instinctive Urge) ہوتا ہے۔۔ اسی کو' آگے بڑھ کر انسانی زندگی میں' جذبات سے تعبیر کیا جاتا ہے۔۔ حیوانات کے برعکس' انسان کے سامنے جب کوئی معاملہ آئے تو اس کی انسانیت کا تقاضا ہے کہ وہ اس پر عقل وبصیرت کی روشنی میں غور وفکر کرے' اس کے موافق اور مخالف پہلوؤں کا' دلائل و براہین کی رو سے' موازنہ کرے۔ تجربات اور مشاہدات کے فراہم کردہ نتائج کو سامنے رکھ کر' اس کے انجام وعواقب پر نگاہ ڈالے' اور اس طرح' امکان بھر تدبر وفکر کے بعد' نہایت ٹھنڈے دل سے کسی فیصلے پر پہنچے۔ حیوان کے پیش نظر مقصد کے راستے میں جب کوئی موانعات آتے ہیں تو اس کے جذبات میں شدت آجاتی ہے۔۔ بالفاظِ دیگر یوں کہئے کہ اس کا غصہ تیز ہو جاتا ہے۔۔ اس لئے کہ اُس کے پاس اس کے سوا مدافعت کا کوئی ذریعہ نہیں ہوتا لیکن انسان کی انسانیت کا تقاضا ہے کہ جب اس کی راہ میں دشواریاں حائل ہوں تو ان پر اور بھی زیادہ ٹھنڈے دل سے غور کرے اور کامل سکون واطمینان سے ان کا حل سوچے۔ حیوانات کے جبلی تقاضوں پر فطرت کی طرف سے کنٹرول عائد ہوتا ہے۔ بڑے سے بڑا خونخوار درندہ بھی' جب تک اسے اپنی حفاظت کے متعلق کسی خطرہ کا احساس نہ ہو' یا اسے بھوک نہ ستائے' کسی پر حملہ نہیں کرتا۔ جب کسی بیل کا پیٹ بھر جاتا ہے تو پھر اسے اس کی پرواہ نہیں رہتی کہ باقی ماندہ چارہ کون کھا رہا ہے۔ حتیٰ کہ حیوانات کا جنسی تقاضا بھی جسے جبلی تقاضوں میں شدید ترین تصور کیا جاتا ہے فطرت کے اشارے کے بغیر بیدار نہیں ہوتا۔

فطرت کا کنٹرول نہیں

لیکن انسان کے جبلی تقاضوں یعنی جذبات پر فطرت نے اپنا کنٹرول عائد نہیں کیا۔ اسے اپنے جذبات پر خود کنٹرول عائد کرنا پڑتا ہے اور یہ کنٹرول عقل وفکر کی رو ہی سے عائد کیا جا سکتا ہے۔ لہٰذا' عقل وفکر اور دانش وبینش' باعثِ شرفِ آدمیت اور موجب جوہر انانیت ہیں اور جبلی تقاضوں (جذبات) کی بے باکی' حیوانیت سے بھی پست سطح زندگی کی مظہر۔

جہاں تک طبیعی قوتوں کا تعلق ہے۔ انسان' حیوانات کے مقابلے میں بڑا کمزور واقع ہوا ہے۔۔۔ نہ اسے ہاتھی جیسی طاقت حاصل ہے' نہ شیر جیسی قوتِ درندگی۔ نہ یہ ہرن

جتنا تیز دوڑ سکتا ہے' نہ عقاب جیسا بلند اڑ سکتا۔۔۔لیکن وہ ان تمام حیوانات کو اپنی عقل و فراست کے زور سے مغلوب اور تابع فرمان بنا سکتا ہے۔

فطرت کی طرف سے سب انسان یکساں واجب التکریم پیدا ہوئے تھے لیکن جب انسانی معاشرہ میں ''میری اور تیری'' کی تفریق و تخصیص پیدا ہوئی تو اُن لوگوں نے جو اپنی ہوسِ اقتدار کو حدود فراموش اور اپنے جذبہء حرص و آز کو قیود نا آشنا بنانا چاہتے تھے۔اس سوال پر غور کیا کہ اپنے ہی جیسے دوسرے انسانوں کو کس طرح اپنا تابع فرمان بنا کر ان کی محنت کے ماحصل کو غصب (Exploit) کیا جائے۔انہوں نے دیکھا کہ بڑے بڑے عظیم المجثہ حیوانات کو اس لئے مغلوب کر لیا جاسکتا ہے کہ وہ عقل و فکر سے عاری ہوتے ہیں۔اس لئے دوسرے انسانوں کو اپنا مطیع اور فرماں پذیر بنانے کا آسان ترین طریقہ یہ ہے کہ انہیں کسی طرح عقل و فکر سے بے گانہ بنا دیا جائے۔ان کی سمجھنے سوچنے کی صلاحیتوں کو مفلوج' اور رفتہ رفتہ مسلوب کر دیا جائے۔۔۔

عقول کی جنگ

آپ تاریخ انسانیت پر غور کیجئے۔آپ دیکھیں گے کہ انسانوں میں' باہمی کش مکش (Battle of Wits) یعنی عقول کی جنگ مسلسل چلی آ رہی ہے۔حاکم و محکوم' آمر و مامور' مطاع و مطیع' مقتدیٰ و مقتدی' آجر و مستاجر' محتاج و مستغنی کی تفریق و تمیز' اسی کش مکش پیہم کے مختلف مظاہر ہیں۔جو زیادہ زیرک اور چالاک تھے انہوں نے ایسے انداز اور طریقے وضع کئے جن سے ان لوگوں کو جو نسبتاً کم عقل و فہم کے مالک تھے' اپنے دامِ تزویر میں لے آئے' اور اس طرح گوشہء سیاست میں حاکم و آمر' دنیائے مذہب میں مطاع و مقتدیٰ اور جہانِ معیشت میں رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى اور اَن داتا بن بیٹھے۔اس کے بعد ایسا انتظام کیا کہ محکوم و مطیع و محتاج طبقہ کی فکری صلاحیتیں ابھرنے نہ پائیں۔

اسے مذہب کہتے ہیں

اس نظام کو جس کی رُو سے انسانوں کی عقل و فکر کے چراغ گُل کئے جاتے ہیں' مذہب کی اصطلاح سے تعبیر کیا جاتا ہے۔آپ اس لفظ کو سن کر شائد چونک اُٹھیں کیونکہ مذہب کا تصور تو عام طور پر کچھ اور ہوتا ہے لیکن میں نے جو کچھ عرض کیا ہے وہ حقیقت پر مبنی ہے۔۔۔مذہب' نجات حاصل کرنے کے ذریعہ ہی کا نام نہیں۔یہ تو مذہب کا ایک گوشہ

ہے۔ ہر وہ نظام جو عقل و فکر' کی صلاحیتوں کو مفلوج کر کے' انسانوں کے ایک گروہ کو دوسرے گروہ کا تابع فرمان بنائے مذہب کہلاتا ہے' خواہ وہ دہریت ہی کا نظام کیوں نہ ہو۔ خدا کی طرف سے عطا کردہ دین' اس نظام کے خلاف چیلنج ہوتا ہے۔ وہ سب سے پہلے یہ اعلان کرتا ہے کہ:-

دینِ خداوندی

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ۔ (۳/۷۸) کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں ۔۔۔ خواہ اسے ضابطہء قوانین' حکومت اور نبوت بھی حاصل کیوں نہ ہو ۔۔۔ کہ وہ دوسرے لوگوں سے کہے کہ تم اللہ کے نہیں' بلکہ میرے محکوم اور فرماں پذیر بن جاؤ۔

یہ دین کا سب سے پہلا اعلان ہوتا ہے جسے وہ بغرضِ اختصار '**لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ**' کے نظریہء حیات کی شکل میں پیش کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ جب دُنیائے انسانیت میں ایسا عظیم انقلاب لائے گا تو وہ سب سے پہلے' اس اصل و بنیاد کو اکھیڑے گا جس پر انسانی تغلب' استبداد اور استحصال کی عمارت استوار ہوتی ہے یعنی فرعونیت (سیاسی استبداد)' ہامانیت (مذہبی اقتدار)' اور قارونیت (معاشی استحصال) کی عمارت وہ اُن اغلال و سلاسل کو توڑے گا جن میں انسانی عقل و فکر کو جکڑ دیا گیا تھا اور ان برفانی سلوں کو اٹھا کر پھینک دے گا جن کے نیچے عقل و شعور کو دبا کر مفلوج کر دیا گیا تھا۔ قرآنِ کریم نے جب حضور نبی اکرم کی بعثت کا مقصد یہ بتایا کہ **وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَ الْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ** (۷/۱۵۷) تو اس کا مفہوم یہی تھا۔ یعنی انسانوں کو ان شکنجوں سے آزاد کر کے' وہ ایسا انتظام کرے گا کہ اس کی فکری صلاحیتیں نشو و نما پاتی ہوئی بلند سے بلند تر ہوتی جائیں تاکہ کوئی انسان دوسرے انسان کو اپنا محکوم و مطیع بنا کر' اس کی محنت کو غصب نہ کر سکے۔

عقل و فکر کی عظمت

آپ قرآنِ کریم کو اٹھا کر دیکھئے۔ آپ کو اس کے ورق ورق پر عقل و شعور کی

اہمیت اور فہم وفراست کی عظمت' تابندہ حروف میں لکھی ملے گی۔ سورۂ اعراف میں ہے کہ آؤ! تمہیں بتائیں کہ جہنم کے مستحق کون لوگ ہیں۔ وہ کہ: **لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا** ز جو سینے میں دل (سوچنے سمجھنے کی صلاحیت) تو رکھتے ہیں' لیکن عقل وفکر سے کام نہیں لیتے۔ **وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُونَ بِهَا** ز جو آنکھیں تو رکھتے ہیں لیکن ان سے دیکھنے کا کام نہیں لیتے۔ **وَلَهُمْ آذَانٌ لَّا يَسْمَعُونَ بِهَا** ط جو کان تو رکھتے ہیں لیکن ان سے سننے کا کام نہیں لیتے۔ **أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ** ۔ یہ لوگ' انسان نہیں۔ حیوانات کے مانند ہوتے ہیں۔ **بَلْ هُمْ أَضَلُّ** ط بلکہ ان سے بھی زیادہ راہ گم کردہ۔ **أُولَٰئِكَ هُمُ الْغٰفِلُونَ.** (۷/۱۷۹) اس لئے کہ یہ ذرائع علم رکھنے کے باوجود بے خبر اور بے علم رہتے ہیں۔ دوسری جگہ ہے کہ جہنم میں داخل ہونے والوں سے اس کا داروغہ پوچھے گا کہ تم کس جرم کی پاداش میں یہاں آ گئے؟ وہ جواب میں کہیں گے کہ اس جرم کی پاداش میں کہ جو لوگ ہم سے عقل وفکر سے کام لینے کے لئے کہتے تھے' ہم ان کی بات نہیں سنتے تھے۔ **لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ أَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِي أَصْحٰبِ السَّعِيرِ.** (۶۷/۱۰) اگر ہم ان کی بات سنتے اور عقل وفکر سے کام لیتے تو ہمارا شمار اہل جہنم میں کیوں ہوتا۔ سورۂ یٰسین میں ہے کہ ان لوگوں سے کہا جائے گا کہ تمہیں متنبہ کیا گیا تھا کہ اپنے بیباک جذبات کے پیچھے نہ لگنا اور عقل وفکر سے کام لینا۔ تم نے ایسا نہ کیا تو اس کا نتیجہ یہ جہنم ہے جس سے تمہیں پہلے متنبہ کر دیا گیا تھا۔ (۳۶/۶۷) آسمانی انقلاب کے اس پیامبر عظیم نے اپنی دعوت پیش کی تو کہا کہ: **أَدْعُوا إِلَى اللَّهِ عَلَىٰ بَصِيرَةٍ أَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِي** ط (۱۲/۱۰۸) میں جو تمہیں خدا کے راستے کی طرف آنے کی دعوت دیتا ہوں تو علیٰ وجہ البصیرت دیتا ہوں۔ میں بھی آیا کرتا ہوں اور میرے متبعین کی بھی یہی روش ہوگی۔ تم اس پر عقل وفکر کی رو سے غور کرو۔ علم وبصیرت کی روشنی میں اسے پرکھو۔ اگر تم اس طرح اس کی صداقت پر مطمئن ہو جاؤ تو قلب ودماغ کی کامل رضامندی سے اس کا اعتراف کرو (اسے ایمان کہا جاتا ہے) اس میں کسی قسم کا جور واکراہ نہیں' جبر واستبداد نہیں۔ **قُلِ الْحَقُّ مِن رَّبِّكُمْ فَمَن شَاءَ فَلْيُؤْمِن وَمَن شَاءَ فَلْيَكْفُرْ** ج (۱۸/۲۹) اے رسولؐ! تم ان سے کہہ دو کہ حق تمہارے رب کی طرف سے آ گیا ہے۔ اب تم میں سے جس کا جی چاہے اسے قبول کر لے جس کا جی چاہے اس سے انکار کر

دیے۔

دین میں جبر نہیں

واضح رہے کہ قرآن کریم نے جب کہا ہے کہ: لَآ اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ۔ (۲/۲۵۶) تو اس کے یہی معنی نہیں کہ تم سے دین بزورِ شمشیر نہیں منوایا جائے گا۔ یہ تو جبر واکراہ کی ایک شکل ہے۔ اس سے کہیں زیادہ شدید جور واکراہ یہ ہے کہ انسانی عقل وفکر کو مفلوج کر کے کسی سے کوئی بات منوا لی جائے۔ یہی وجہ ہے کہ دین اپنے آپ کو فوق الفطرت معجزات اور محیرالعقول کرامات کے زور سے نہیں منواتا۔ قرآن کے اولین مخاطب جو مذہب کے خوگر تھے' رسولؐ اللہ سے بار بار معجزات طلب کرتے رہے اور حضورؐ ان سے ہر بار یہی فرماتے رہے کہ میں تم سے کہتا ہوں کہ تم اپنی عقل وفکر سے کام لے کر دیکھو کہ میری دعوت' حق وصداقت پر مبنی ہے یا نہیں اور تم چاہتے ہو کہ میں تمہاری سمجھنے سوچنے کی صلاحیتوں کو مفلوج کر کے' تم سے اپنی بات منوالوں۔ تم عجیب قسم کے انسان ہو! چنانچہ آپؐ ان سے تاکیداً فرماتے کہ انسانی زندگی کا یہ بنیادی اصول یاد رکھو کہ: لَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ۔ جس بات کا تمہیں علم نہ ہو' اس کے پیچھے مت لگا کرو۔ یاد رکھو۔ اِنَّ السَّمْعَ وَ الْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا۔ (۱۷/۳۶) سماعت بصارت اور فہم وادراک' ہر ایک سے پوچھا جائے گا کہ تم نے پوری تحقیق کے بعد ایسا فیصلہ کیا تھا؟ رسولؐ اللہ اپنی دعوت کو عقل وبصیرت کی رُو سے پیش فرماتے اور اپنے مخالفین سے کہتے کہ: هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (۲/۱۱۱) تم اگر سچے ہو تو اپنے دعویٰ کی تائید میں دلیل وبرہان پیش کرو۔ دھاندلی سے نہ میں کوئی بات منوانا چاہتا ہوں' نہ تم منواؤ۔ میں بھی اپنی بات کی تائید میں دلائل وبراہین پیش کرتا ہوں' تم اگر اسے رد کرتے ہو تو تم بھی دلیل وبرہان کی رو سے ایسا کرو۔

سوچا کرو

تصریحات بالا سے واضح ہے کہ قرآنِ کریم عقل وفکر کو کس قدر اہمیت دیتا ہے۔ اس سلسلہ میں سورۂ سبا کی ایک آیت ایسی جامع ہے جس میں قرآن نے تمام تفاصیل کو چند الفاظ میں سمٹا کر رکھ دیا ہے اور اگر کہا جائے کہ وہ اس باب میں حرفِ آخر ہے تو اس میں

کچھ بھی مبالغہ نہیں ہوگا۔ نبی اکرمؐ عمر بھر اپنی دعوت کو پیش کرتے رہے' اس کے لئے آپؐ نے مختلف طرق و اسالیب اختیار فرمائے۔ یہ ظاہر ہے کہ قرآنی تعلیم کے متنوع گوشے ہیں۔ یہ انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں کو محیط ہے۔ اس تعلیم کی وسعتیں حدود فراموش اور اس کے موضوع قیود نا آشنا ہیں۔ لیکن آپ غور کیجئے کہ اس قسم کی تعلیم کا مبلغ اپنے مخاطبین سے کہتا ہے کہ میں تم سے کوئی لمبی چوڑی باتیں نہیں کرنا چاہتا۔ میں ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔ صرف ایک بات۔ **قُلْ اِنَّمَآ اَعِظُكُمْ بِوَاحِدَةٍ**۔ آپ اندازہ لگائیے کہ وہ بات کس قدر اہم اور بنیادی ہوگی۔ وہ ایسی بات ہوگی جس میں اسلام کی ساری تعلیم کا نچوڑ آ جائے ظاہر ہے کہ ایسی بات سننے کے لئے ہر مخاطب آمادہ ہو جائے گا۔ اس کے بعد آپؐ ان سے کہتے ہیں کہ: **اَنْ تَقُوْمُوْا لِلّٰهِ مَثْنٰى وَ فُرَادٰى**۔ اس بات کے سننے کے لئے اگر تم سب کے سب رکنا نہیں چاہتے تو تمہاری مرضی۔ تم ایک ایک دو دو کر کے ہی رک جاؤ اور اللہ کے لئے کھڑے ہو جاؤ۔ جب آپؐ نے اس طرح ان کی توجہات کو اپنی طرف مرکوز کر لیا تو فرمایا کہ وہ ایک بات جو میں تم سے کہنا چاہتا ہوں' یہ ہے کہ **تَتَفَكَّرُوْا** (۳۴/۴۶) تم سوچا کرو۔ غور و فکر کیا کرو۔ عقل و بینش سے کام لیا کرو۔ بس یہی تھی وہ ایک بات جو میں تم سے کہنا چاہتا تھا۔ اگر تم نے عقل و فکر سے کام لینا شروع کر دیا تو میرا مرحلہ آسان ہو گیا۔

مومن کسے کہتے ہیں

آپ کو عزیزان گرامی قدر! معلوم ہے کہ قرآن کریم کی رو سے مومن کی بنیادی خصوصیت کیا ہے؟ یعنی وہ خصوصیت جس کے بغیر ایک انسان' مومن نہیں کہلا سکتا۔ سنئے' اور غور سے سنئے:

وَالَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَ عُمْيَانًا۔ (۲۵/۷۳)

مومن وہ ہیں کہ اور تو اور' جب ان کے سامنے آیات خداوندی بھی پیش کی جاتی ہیں تو وہ ان پر بھی بہرے اور اندھے بن کر نہیں گر پڑتے۔

یہ ہے مومن کی بنیادی خصوصیت ہمارے ہاں لفظ ایمان کا ''انگریزی زبان میں ترجمہ (Faith) کیا جاتا ہے۔ یہ غلط ہے۔ ایمان (Faith) یعنی اندھی عقیدت نہیں۔ یہ اس

اعتراف حقیقت کا نام ہے جو دل و دماغ کے پورے اطمینان کے بعد' عقل و فکر کی رو سے' کیا جائے۔ اسے آپ (Conviction) کہہ سکتے ہیں۔'' مذہب کی بنیاد (Faith) یعنی اندھے یقین پر ہوتی ہے۔ دین علیٰ وجہ البصیرت (By Conviction) اختیار کیا جاتا ہے۔ مذہب کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ :۔

بے سجادہ رنگیں کن گرت پیر مغاں گوید
کہ سالک بے خبر نبود ز راہ و رسم منزلہا

اور دین یہ کہتا ہے کہ سالک تو ایک طرف' تم خدا کی بات بھی سوچے سمجھے بغیر نہ مانو۔ اس سے واضح ہے کہ دین' درحقیقت' مذہب کے خلاف چیلنج ہے۔ ضمناً' اس سے یہ حقیقت بھی آپ کے سامنے آ گئی ہوگی کہ میں نے جو اپنی کتاب کا نام (Islam A Challenge To Religion) رکھا ہے تو وہ قرآن ہی کی پیش کردہ حقیقت پر مبنی ہے۔

جذبات' عقل اور وحی

قرآن کریم نے' جذبات' عقل اور وحی کے تعلقات کو' دو آیات میں' اپنے مخصوص' حسن ایجاز کے ساتھ بیان کر دیا ہے۔ سورۂ جاثیہ میں ہے: **اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰهُ** کیا تو نے اس شخص' یا اس قوم کی حالت پر بھی غور کیا ہے جس نے اپنے جذبات ہی کو اپنا خدا بنا لیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ **وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ** وہ علم و بصیرت رکھنے کے باوجود صحیح راستے سے بھٹک گیا۔ **وَّخَتَمَ عَلٰى سَمْعِهٖ وَقَلْبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشٰوَةً** اور اس کے سننے' دیکھنے' سمجھنے' سوچنے کی صلاحیتیں مفلوج ہو گئیں۔ **فَمَنْ يَّهْدِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ اللّٰهِ** ...... (۴۵/۲۳) جو اس طرح جذبات سے مغلوب ہو جائے اسے صحیح راستہ کون دکھا سکتا ہے؟ یعنی جب انسان جذبات سے مغلوب ہو جاتا ہے تو اس کا علم اسے کچھ فائدہ نہیں دیتا' اور اس کی فکر و دانش کی صلاحیتیں ناکارہ ہو جاتی ہیں۔ دوسری جگہ ہے کہ تم تاریخ کے اوراق پر غور کرو۔ اس میں تمہیں ایسی قومیں دکھائی دیں گی جو بڑی بڑی وسیع و عریض سلطنتوں کی مالک تھیں۔ نہایت درخشندہ و تابناک تہذیب کی حامل تھیں۔ علم و فضل میں ان کا مقام بہت بلند تھا۔ ان کے سمجھنے سوچنے کی صلاحیتیں بڑی نمایاں تھیں۔ لیکن اس کے باوجود' وہ تباہ و برباد ہو گئیں۔ یہ اس لئے کہ انہوں نے اپنے علم و عقل کو مستقل اقدار خداوندی کے تابع نہ رکھا۔ **فَمَآ**

اَغۡنٰی عَنۡهُمۡ سَمۡعُهُمۡ وَلَاۤ اَبۡصَارُهُمۡ وَلَاۤ اَفۡئِدَتُهُمۡ مِّنۡ شَیۡءٍ اِذۡ كَانُوۡا یَجۡحَدُوۡنَ ۙ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ (۴۶/۲۶)۔ جب انہوں نے اقدار وقوانین خداوندی سے انکار کیا اور سرکشی برتی تو ان کا علم وبصیرت ان کے کسی کام نہ آیا اور وہ تباہی کے جہنم میں جا گریں۔ اس دعویٰ کی شہادت کے لئے ہمیں تاریخ کے اوراق کو پیچھے کی طرف الٹنے کی ضرورت نہیں۔ خود ہمارے زمانے میں اقوام مغرب کی حالت اس کی شاہد ہے۔ علم وعقل کا یہ عالم کہ اس سے پہلے کوئی اور قوم شاید ہی اس بلندی پر پہنچ پائی ہو اور اس کے باوجود جہنمی زندگی کی یہ کیفیت کہ شاید ہی کوئی قلب ایسا ہو جسے اطمینان نصیب ہو۔ یہ اس لئے کہ ان اقوام نے اپنے حیوانی جذبات کو عقل وبصیرت کے تابع نہیں رکھا اور عقل و بصیرت سے مستقل اقدار خداوندی کی روشنی میں کام نہیں لیا۔ اقبالؒ کے الفاظ میں عصر حاضر کے انسان کی کیفیت یہ ہے کہ :۔

عشق ناپید و خرد می گزدش صورت مار — عقل کو تابع فرمان نظر کر نہ سکا
ڈھونڈنے والا ستاروں کی گذرگاہوں کا — اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا
زندگی کی شب تاریک سحر کر نہ سکا

ان تصریحات سے واضح ہے کہ دین کا اساسی اصول یہ ہے کہ انسانی جذبات کو عقل و بصیرت کے تابع رکھا جائے اور عقل وبصیرت سے اقدار وقوانین خداوندی کی روشنی میں کام لیا جائے جو وحی کی رو سے عطا ہوتے ہیں۔

☆☆☆☆☆☆☆

دین کا نظام

یہ تھا وہ دین جسے خدا نے نوع انسان کی راہنمائی کے لئے دیا تھا۔ اس کی روشنی میں حضور نبی اکرمؐ نے ایسا نظام متشکل فرمایا جس میں (۱) کوئی فرد کسی دوسرے فرد کا محکوم نہیں تھا۔ اس میں تمام افراد قوانین خداوندی کی اطاعت کرتے تھے۔ (۲) کوئی فرد کسی دوسرے فرد کا محتاج نہیں تھا۔ رزق کے سرچشمے ہر ایک کے لئے یکساں طور پر کھلے تھے کسی کی ذاتی ملکیت میں نہیں تھے۔ (۳) اس میں مذہبی پیشوائیت کا وجود ختم کر دیا گیا تھا اور (۴) انسانی عقل وفکر پر وحی کی مستقل اقدار کے سوا کوئی پابندی نہیں تھی۔ اس سے انسانی

فکر کو اپنی نشو ونما کے پورے پورے مواقع حاصل ہو گئے۔ آسمان کی آنکھ نے صفحہ ارض پر اس سے زیادہ انسانیت ساز دور اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا اور کیفیت یہ تھی کہ: ؎

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے تھے
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا' مہِ کامل نہ بن جائے

دین کی جگہ مذہب

یہ نظام تھوڑی دور چلا تھا کہ استحصالی قوتوں (Forces of Exploitation) نے پھر سر اُبھارا اور رفتہ رفتہ دین کی جگہ پھر سے مذہب نے لے لی۔ میں اس وقت' عزیزانِ من! اس تاریخی تحقیق کی طرف نہیں جانا چاہتا کہ اس تبدیلی کے اسباب وعلل کیا تھے؟ یہ بجائے خویش ایک مستقل موضوع ہے اور اگر میں نے اسے اس مقام پر ضمناً چھیڑا تو نہ صرف یہ کہ میں اپنے موضوع سے دور نکل جاؤں گا بلکہ قلت وقت کی بنا پر دونوں موضوع تشنہ رہ جائیں گے۔[1]

بہرحال' سلب ونہب کی قوتیں پھر ابھریں اور دین کے خلاف نبرد آزما ہو گئیں۔ ان کے پیش نظر اولین مقصد یہ تھا کہ عقل وفکر کی شمعیں گل کر دی جائیں۔ سمجھنے سوچنے کی صلاحیتیں مفلوج کر دی جائیں۔ اس کے لئے کیا کچھ کیا گیا' یہ پھر تاریخی تفصیل ہے جس میں' میں اس وقت نہیں جانا چاہتا۔ اس وقت' میں صرف اتنا اشارہ کر کے آگے بڑھ جانا چاہتا ہوں کہ وہ جسے ہماری تاریخ میں' اشاعرہ اور معتزلہ کی کش مکش کو یوں بیان کر کے آگے بڑھایا جاتا ہے گویا وہ دو فرقوں کے عقائد کی آویزش تھی' وہ درحقیقت مذہب اور دین کی وہی کش مکش تھی جس کی طرف میں نے ابھی ابھی اشارہ کیا ہے۔ مذہب کے پاس دلیل و برہان تو ہوتی نہیں۔ اس کا سب سے زیادہ خطرناک حربہ لیبل تراشی ہوتا ہے وہ ایک لیبل وضع کرتا ہے اور مسلسل پراپیگنڈہ سے اسے اس قدر گھناؤنا اور نفرت انگیز بنا دیتا ہے کہ وہ جس پر اسے چسپاں کر دے' عوام اس کے خلاف امنڈ پڑتے ہیں۔ مذہب کی طرف سے اس قسم کی لیبل تراشیوں نے کس قدر تباہیاں مچائی ہیں' اس کے لئے تاریخ میں زیادہ دور جانے کی ضرورت نہیں۔ تین چار صدیاں پہلے' یورپ کی اس تاریخ کا سامنے لانا کافی ہو گا جس میں مذہب اور عقلیت (Rationalism) کی معرکہ آرائیاں' انسانیت کے خون سے لکھی ملتی ہیں۔ گوئٹے نے کہا ہے کہ سب سے وحشت انگیز منظر وہ ہوتا

---

[1] پرویز صاحب نے اب اسے اپنی معرکۃ آرا تصنیف "شاہکار رسالت۔ عمر فاروق" کے آخری باب میں بڑی تفصیل سے واضح کر دیا ہے۔ (طلوع اسلام)

ہے جب جہالت عملاً میدان میں آ جائے۔ مذہب کی عقل پرستی کے خلاف جنگ اسی قسم
کے وحشت و بربریت کے لرزہ انگیز مناظر پیش کرتی ہے' خواہ وہ کسی زمانے میں لڑی گئی ہو
اور فریق مقابل کوئی سی قوم اور کوئی سا مذہب بھی کیوں نہ ہو۔

تصوف اور عقل

ہماری تاریخ میں بھی' عقل و فکر اور علم و بصیرت کے چراغ گل کرنے کے لئے
اسی قسم کے جھکڑ چلے۔ اس میں افراد کے ساتھ کیا ہوا' اسے تو چھوڑیئے' انسانیت کا سب
سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ ان لوگوں کی کتابوں کا ایک ایک ورق تلف کر دیا گیا۔ جب اس
بحران میں ذرا کمی ہوئی' تو رہی سہی کسر تصوف کی برفانی سلوں نے پوری کر دی۔ تاریخ
فلسفہ سے واقف حضرات اس حقیقت سے بے خبر نہیں کہ تصوف (خواہ وہ کسی نام سے موسوم
اور کسی پیکر میں جلوہ فرما ہو) درحقیقت افلاطون کے اس نظریہ کی صدائے بازگشت ہے جس
کی رو سے اس نے کہا تھا کہ حواس کے ذریعے حاصل شدہ علم' قطعاً قابل اعتماد نہیں ہوتا
قابل اعتماد وہی علم ہے جو باطنی طور پر حاصل ہو۔ اس طرح مذہب اور تصوف' دونوں
مل کر' علم و عقل کے چراغ گل کر دیئے اور اس کا نام دین کی خدمت رکھا۔ لاک نے
کہ جو لوگ وحی کا چراغ روشن کرنے کے لئے عقل کے دیئے بجھا دیتے ہیں وہ درحقیقت
عقل اور وحی دونوں کے چراغ گل کر دیتے ہیں۔ ہماری تاریخ اس حقیقت کی نمایاں مثال
ہے۔ یہاں عقل و فکر کے چراغ گل کرنے کے لئے جو کوششیں ہوئیں' ان سے یہ چراغ
گل ہوئے ہی تھے' ان کے ساتھ ہی قرآن جیسی قندیل جہاں تاب بھی ان کی توہم پرستیوں
اور افسانہ طرازیوں کے فانوسوں میں اس طرح چھپی کہ اس کا صرف نام زبانوں پر
باقی رہ گیا۔

میں ابھی ابھی' برادرانِ گرامی قدر! ان معرکہ آرائیوں کا ذکر کر رہا تھا جو گذشتہ
چند صدیوں میں یورپ میں عقل اور مذہب کے مابین ظہور میں آئیں۔ اس کش مکش میں
بظاہر ایسا نظر آتا تھا جیسے عقل پرستی کی تحریک کامیاب ہوئی اور مذہب کو گرجوں کی
گاہوں میں دبک کر بیٹھ جانا پڑا۔ یہ ٹھیک ہے کہ عیسائیت کا وہاں یہی حشر ہوا۔ لیکن جیسا
میں نے شروع میں کہا ہے۔ مذہب' صرف مذعومہ ''خدا پرستی'' کا نام نہیں۔ مذہب' ہر
تحریک کو کہتے ہیں جو علم و عقل کے چراغ گل کرنے کے لئے اٹھے۔ اس نقطہء نگاہ

دیکھئے تو آپ کو نظر آئے گا کہ مذہب بڑا سخت جان واقع ہوا ہے۔ قرآن نے جو کہا ہے کہ ابلیس کو قیامت تک کے لئے زندہ رہنے کی مہلت دے دی گئی ہے تو اس سے یہی مراد ہے۔ چنانچہ ہوتا یہ ہے کہ مذہب کے کسی ایک پیکر کو شکست ہوتی ہے تو وہ کسی دوسرے پیکر میں نمودار ہو جاتا ہے۔ اقبالؒ کے الفاظ میں۔

بدل کے بھیس زمانے میں پھر سے آتے ہیں
اگرچہ پیر ہے آدم، جواں ہیں لات و منات

عوامی تحریک

یورپ میں عیسائیت کو شکست ہوئی تو مذہب ایک اور لبادہ اوڑھ کر مقابلہ میں آ گیا۔ اس کے اس جدید لبادہ کا نام، عوامی تحریک یا (Mass Movement) ہے۔ جس طرح دورِ حاضر کے آلاتِ جنگ، سابقہ زمانوں کے آلات کے مقابلہ میں کہیں زیادہ خطرناک اور تباہ کن ہیں، اسی طرح مذہب کا یہ جدید لبادہ، اس کے سابقہ پیکروں کے مقابلہ میں کہیں زیادہ مہیب اور تخریبی ہے۔ نازی ازم، فاشی ازم، کیمونزم وغیرہ عوامی تحریکات، مذہب کے انہی جدید لبادوں کا نام ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ انہیں تحریک کہنا غلطی ہے۔ انہیں ہنگامہ، یا شورش یا ہیجان (Agitation) کہنا زیادہ صحیح ہوگا۔ تحریک تو صرف ایک ہی ہو سکتی ہے۔ یعنی کاروانِ انسانیت کا، عقل اور وحی کی روشنی میں، آہستہ آہستہ، نسیم سحری کی خوش خرامیوں کے ساتھ اپنی متعینہ منزل کی طرف بڑھتے چلے جانا۔ تحریک صرف یہی کہلا سکتی ہے۔ باقی سب جذباتی تلاطم خیزیوں کی وقتی ہنگامہ آرائیاں ہوتی ہیں جو سیلاب کی طرح امنڈتی ہیں اور چند دنوں کی قیامت خیز تخریب کے بعد وقت کے سمندر میں جا ڈوبتی ہیں۔۔ یہی وہ ہنگامے ہوتے ہیں جن کے متعلق اقبالؒ نے کہا ہے کہ: ؎

اس سیلِ سبک سیر و زمیں گیر کے آگے!
عقل و نظر و علم و ہنر ہیں خس و خاشاک

ایک تو یورپ کی یہ تحریکیں (یعنی مشتعل اور بیباک جذبات کے طوفانوں پر مبنی شورشیں) بڑی ہمہ گیر تھیں۔ دوسرے اس دور میں عام وسائل رسل و رسائل کی فراوانی ہے۔ اس کی وجہ سے، دنیا کا کوئی حصہ بھی ان کے اثرات سے محفوظ نہ رہ سکا۔ جب ان کے اثر و نفوذ کی عالمگیریت کی یہ کیفیت تھی تو ظاہر ہے کہ ہندوستان کے مسلمان اس سے کیسے

متاثر رہتے اور اصل تو یہ ہے کہ مسلمان اس قسم کی جذباتی تحریکوں کی زد میں سب سے پہلے آنے والی قوم تھی۔ ان کے ہاں صدیوں سے مذہب یعنی عقل وفکر کے خلاف جذبات پرستی کا دور دورہ تھا۔ یہ تو وہ ''بھک سے اڑنے والا'' مادہ (Explosive) تھا جسے صرف فتیلہ دکھانے کی دیر تھی کہ وہ شعلہء جوالہ بن جاتا۔

ہندی مسلمانوں کی زندگی

آپ ہندی مسلمانوں کی سیاسی زندگی پر طائرانہ نگاہ ڈالیئے۔ اگر آپ اس مطالعہ کی ابتداء جنگ بلقان اور طرابلس سے کر کے ۳۶-۱۹۳۵ء تک اس کے ساتھ ساتھ چلے آئیں گے تو آپ دیکھیں گے کہ یہ ایک قوم نہیں تھی۔ آتش سیال کا طوفانی دریا تھی جو ذرا ذرا سے اشتعال پر یوں بھڑک اٹھتی تھی کہ سارا ماحول اس کی لپیٹ میں آ جاتا تھا لیکن تھوڑے ہی عرصہ کے بعد اس کی شعلہ فشانیاں ٹھنڈی پڑ جاتی تھیں اور دیکھنے والی آنکھیں دیکھتی تھیں کہ اس کی ان شرر باریوں سے اس کے ماحول میں تو کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی لیکن یہ خود راکھ کا ڈھیر بن کر رہ گئی لیکن کچھ عرصہ کے بعد یہی راکھ کا ڈھیر پھر ایک جھکڑ بن کر اٹھتا اور ساری فضا کو طوفان آمیز کر دیتا۔ اس طوفان بلاخیز کی برق رفتاریوں سے یوں نظر آتا جیسے وہ اس جہان ناسازگار کے محکم ترین قلعوں کی بنیادوں تک کو ہلا کر انہیں خس و خاشاک کی طرح نذرِ باد کر دیں گی لیکن تھوری دیر کے بعد معلوم ہو جاتا کہ یہ طوفان انگیزی بس بگولے کا رقص تھا جو اپنے ہی گرد گھوما اور خود ہی تھک کر خاموش ہو گیا۔ لیکن اس کے بعد اس کی یہ خاموشی، وہ سکوت ثابت ہوتی جو سمندر میں تازہ تلاطم خیزیوں کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔ اس کے بحر بے کراں سے بلا انگیز موجیں اٹھتیں اور یوں محسوس ہوتا گویا اس جہان پیر کی موت قریب آ گئی ہے اور اس سیل بے پناہ کے سامنے اس کی حیثیت حباب سے زیادہ کچھ نہیں لیکن تھوڑی دیر کے بعد، یہ مضطرب و بے قرار موجیں باہمد گر ٹکرا کر غرق دریا ہو جاتیں اور سطح آب پر ان کا نقش قدم تک دکھائی نہ دیتا۔ اس قوم کی یہ سیمابی کیفیت اس لئے تھی کہ صدیوں کی مذہب پرستی سے اس کی عقل وفکر کی صلاحیتیں شل ہو چکی تھیں اور یہ ہمہ تن جذبات بن کر رہ گئی تھی۔ سرسید نے زباں پہ بار خدایا یہ کس کا نام آیا؟ تاریکیوں کے اس ہولناک ویرانے میں فکر کی کچھ شمعیں روشن کرنے کی کوشش کی، لیکن مذہب پرستی کے جھکڑوں نے انہیں چراغ تہ داماں بنا دیا۔

قبالؒ کا پیغام

اقبالؒ نے جب اس قوم کی ان بے مقصد ہنگامہ آرائیوں اور بلاتعین منزل صحرا دردیوں پر نگاہ ڈالی تو اس کے دل دردمند سے اک ہوک اٹھی اور اس نے ۱۹۳۰ء میں لہ آباد کے مقام پر اپنے مشہور خطبہء صدارت میں اس آہوئے رم خوردہ کے لئے منزل کا عین کیا اور قوم کو اس پر متانت اور سنجیدگی سے غور کرنے کی دعوت دی لیکن قوم جذبات کے ہجوم میں اس قدر کھوئی ہوئی تھی کہ کسی نے اس رازدان راہ حیات کی اس صدائے جیل کو درخور اعتنا نہ سمجھا اور اسے ایک شاعر کا تخیل اور دیوانے کا خواب کہہ کر حوالہء طنز و مزاح کر دیا اور خود پھر انہی ہنگامہ آرائیوں میں منہمک ہو گئی۔ ۱۹۳۲ء میں جب اقبالؒ کو آل انڈیا مسلم کانفرنس کے سالانہ اجلاس (منعقدہ لاہور) کا صدر منتخب کیا گیا تو انہوں نے اپنے خطبہء صدارت کے آغاز میں قوم کی اس ہنگامہ خیز جذباتیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ ملک کی یہ حالت ہو چکی ہے کہ ایک طرف سے ہمارے کان میں یہ آواز آتی ہے کہ:-

> اگر ان حالات میں ہمارے لیڈروں نے قوم کے لئے کوئی متعین راہ عمل تجویز نہ کی تو اس وقت دوسروں کی نقالی سے جو کچھ کیا جا رہا ہے وہ رنگ لا کر رہے گا جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ قوم کا نوجوان طبقہ حوادث زمانہ کے سیل بے پناہ میں بلاسوچے سمجھے کود پڑے گا۔

تو دوسری طرف سے ایک نوجوان، انتہائے جوش و خروش میں، یہ کہتا ہوا آگے بڑھتا ہے کہ:

> عمل کے لئے کسی متعین راستے اور سوچے سمجھے منصوبے کی ضرورت نہیں۔ یہ سبق درسگاہوں کی منطق میں نہیں پڑھایا جا سکتا۔ یہ جذبہ دل کی گہرائیوں سے ابھر کر فضا میں پھیل جاتا ہے تو اپنی منطق آپ مرتب کر لیتا ہے۔

اس کے بعد حضرت علامہ نے فرمایا کہ:-

> ان شورش انگیزیوں میں آپ نے اس اجتماع کی صدارت کے لئے ایک مفکر کا انتخاب کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ آپ نے ایسا اس لئے کیا ہے کہ آپ کو اس حقیقت کا احساس ہوا ہے کہ ایسے وقت میں

قوم کو ایک مفکر کی ضرورت ہے اور یہ حقیقت بھی ہے کہ جس قوم میں
فکری صلاحیت نہیں رہتی' وہ قوم تباہ ہو جاتی ہے۔

قائداعظمؒ

ان کے اپنے الفاظ جو میرے خیال میں آج پاکستان کے ہر در و دیوار پر تابندہ حروف میں لکھ دینے چاہئیں' یہ تھے کہ (Where There is no Vision People Perish) اقبالؒ کی یہ آواز بظاہر قوم کی ہنگامہ آرائیوں کے نقار خانہ میں گم ہو کر رہ گئی لیکن وہ جو کہتے ہیں کہ (No True Voice is Ever Lost) حق کی آواز کبھی صدا بصحرا ثابت نہیں ہوتی تو ایک ایسا کان بھی تھا جس نے اسے ان ہنگاموں سے دور بیٹھے سنا اور اپنے صدف قلب میں محفوظ رکھ لیا۔ یہ تھا قائداعظم محمد علی جناحؒ وہ محمد علی جناحؒ جو فکر و تدبر کا مجسمہ متانت و سنجیدگی کا پیکر' صداقت و دیانت کا فشردہ اور اقبالؒ کی اس مقدس دعا کا حسین امین تھا جس میں اس نے کہا تھا کہ :-

سازی اگر حریفِ یم بیکراں مرا
با اضطراب موج' سکونِ گہر بدہ

ہماری ہزار سالہ تاریخ میں یہ پہلی سیاسی تحریک تھی جس میں ہنگامہ آرائی اور شورش انگیزی کا شائبہ تک نہ تھا جو قرآنی فکر کی روشنی میں' سکوتِ دریا میں بط کی سی خاموشی کے ساتھ جانب ساحل رواں دواں چلی جارہی تھی۔۔ مانندِ کہکشاں بگریبانِ مرغزار۔۔اس کا نتیجہ یہ تھا کہ اس سے دس سال کی قلیل ترین مدت میں ایک قطرہء خون بہائے بغیر۔۔حتیٰ کہ کسی کو ایک گالی دیئے بغیر۔۔ پاکستان جیسی وسیع و عریض مملکت حاصل کر لی گئی اور اس طرح ثابت کر کے دکھا دیا گیا کہ قوموں کی تعمیر فکر سے ہوتی ہے ہنگاموں سے نہیں اور اس قسم کی فکری تحریکیں ان قائدین کے ہاتھوں پروان چڑھتی ہیں' جن کی کیفیت یہ ہو کہ :

نگہ بلند' سخن دلنواز' جاں پُرسوز
یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کے لئے

☆☆☆☆☆☆☆

اس طرح یہ فکری تحریک کامیاب ہوئی لیکن جس طرح یورپ میں مذہب نے اپنی شکست خوردگی کے بعد عوامی تحریکیوں کا پیکر اختیار کیا تھا بدقسمتی سے ہمارے ساتھ بھی

یہی ہوا۔ تشکیل پاکستان کے ساتھ ہی وہ مذہب جو تحریک پاکستان کے دوران کونوں کھدروں میں چھپ گیا تھا پاکستان میں ایک منظم عوامی تحریک کی شکل میں نمودار ہوا اور ملک کی فضا کو آندھیوں اور جھگڑوں کی آماجگاہ بنائے چلا گیا۔

☆☆☆☆☆☆☆

(پرویز صاحب نے اس مقام پر ان آندھیوں اور جھگڑوں کی کچھ مثالیں پیش کی تھیں' لیکن حالیہ ہنگامے اس حقیقت کو ابھار کر سامنے لے آئے ہیں کہ اس موضوع پر ضمناً کچھ لکھنا مفید نہیں ہو سکتا۔ اس پر تفصیل سے لکھنے کی ضرورت ہے جس کے لئے مناسب وقت کا انتظار کرنا چاہئے۔ بنا بریں اس مقام پر ان مثالوں کو حذف کر کے ہم عوامی تحریکوں کی اس اصولی بحث سے سلسلۂ کلام کا اجراء کرتے ہیں جس سے پرویز صاحب نے بات آگے بڑھائی تھی۔)

عوامی تحریک کے عناصر

قبل اس کے کہ میں آگے بڑھوں میں ضروری سمجھتا ہوں کہ مختصر الفاظ میں یہ عرض کر دوں کہ ایسی تحریکیں کن عناصر سے ترکیب پاتی ہیں۔ ان کی خصوصیات اور لزومات کیا ہوتے ہیں۔ وہ کس قسم کے لوگوں پر مشتمل ہوتی ہیں اور انہیں کامیاب بنانے کے کیا کیا طریق اختیار کیے جاتے ہیں۔ یہ ہمارے پیشِ نظر موضوع کا بڑا اہم اور بنیادی گوشہ ہے۔ اس لئے مجھے امید ہے کہ آپ اسے کامل غور و فکر سے سماعت فرمائیں گے۔

(۱) سب سے پہلے یہ سمجھ لیجئے کہ عوامی تحریک کے پیشِ نظر کوئی تعمیری مقصد نہیں ہوتا۔ اس کے پیشِ نظر تخریب ہوتی ہے جس کے لئے وہ معاشرہ میں مسلسل خلفشار اور انتشار (Chaos) پیدا کرتی رہتی ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ عوام کے جذبات کو مشتعل کیا اور مشتعل رکھا جائے اور انہیں عقل و فکر اور غور و تدبر کی طرف آنے نہ دیا جائے ایسے لوگوں کو مذہبی دیوانے (Religious Fanatics) کہا جاتا ہے۔

(۲) عوامی تحریک میں وہ لوگ شامل ہوتے ہیں جو اپنی موجودہ زندگی سے غیر مطمئن بلکہ بیزار ہوں' اور مستقبل کی طرف سے مایوس۔ اس میں معاشی ناہمواریوں کو بنیادی طور پر دخل ہوتا ہے۔ یوں تو طبعاتی تفریق کا آغاز اس وقت ہو گیا تھا جب ابلیس نے ابن آدم

کے کان میں ''میری اور تیری'' کا افسوں پھونکا تھا لیکن جب کسی قوم میں ایسے حالات پیدا ہو جائیں کہ ایک طبقہ دیکھتے ہی دیکھتے کوڑیوں سے کروڑوں کا مالک بن جائے تو (Haves) اور (Have-Nots) کی تفریق بڑی نمایاں ہو جاتی ہے۔ اس سے نچلا طبقہ اپنی موجودہ حالت سے بے حد غیر مطمئن ہو جاتا ہے۔ عوامی تحریک چلانے والے اس صورت حالات سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ان کی ٹیکنیک یہ ہوتی ہے کہ وہ حال (Present) کو مسلسل کوستے رہتے ہیں۔ اس کے ہر گوشے میں کیڑے ڈالتے رہتے ہیں۔ اس کی خرابیوں کو اچھال اچھال کر نہایت مبالغہ آمیز انداز سے سامنے لاتے رہتے اور اس طرح اس کے خلاف عوام کے جذبات نفرت کو مشتعل کئے چلے جاتے ہیں۔ مذہب کے نام پر عوامی تحریک کے علمبردار، معاشرہ کی ہر اخلاقی خرابی کا ذمہ دار اوپر کے طبقہ کو قرار دے کر اس کے خلاف نفرت کے جذبات ابھارتے رہتے ہیں اور عوام کے دل میں یہ یقین راسخ کر دیتے ہیں کہ ان کی مفلسی اور پریشان حالی کی واحد ذمہ دار اوپر کے طبقہ کی بداعمالیاں ہیں۔

(۳) اس تحریک کے علمبردار اس حال کو اس قدر قابل نفرت دکھانے کے ساتھ ساتھ، مستقبل کو اس قدر درخشندہ و تابناک دکھاتے ہیں کہ مایوسوں اور محروموں کی آنکھیں چندھیا جاتی ہیں۔ وہ ان کے دلوں میں ناممکن الحصول امیدوں کے جگمگاتے چراغ روشن کر دیتے ہیں اور ان سے کہتے ہیں کہ اگر ایک دفعہ اقتدار ہمارے ہاتھ میں آ گیا تو تم دیکھو گے کہ تمہاری زندگی کس طرح مسرتوں کے جھولے جھولتی ہے۔ مذہب پرست طبقہ جو ماضی کو اس قدر درخشندہ بنا کر دکھاتا ہے۔ اس سے بھی یہی مقصد ہوتا ہے کہ اس کے مقابلہ میں حال بے حد گھناؤنا نظر آئے اور جب وہ عوام سے کہیں کہ جس نظام کی طرف ہم دعوت دیتے ہیں وہ ایک بار پھر سے اسی قسم کی جنتی زندگی کا نظارہ دکھا دے گا تو وہ دیوانہ وار لپک کر ان کے پیچھے ہو لیں۔

(۴) عوام کے دل میں موہوم امیدوں کے چراغ روشن کر کے مستقبل کے فریب تخیل کو زندہ رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ ان سے کوئی بات متعین طور پر نہ کہی جائے بلکہ اپنے پروگرام کو مبہم لیکن نہایت دلکش اور جاذب اصطلاحات کے پردوں میں پیش کیا جائے۔ متعین اور واضح پروگرام سامنے رکھنے میں نقص یہ ہوتا ہے کہ متبعین (Followers)

قدم قدم پر ماپنے لگ جاتے ہیں کہ ہم اس نصب العین کے قریب پہنچتے جا رہے ہیں یا نہیں۔ جب وہ دیکھتے ہیں کہ ایسا نہیں ہو رہا تو وہ بددل ہو جاتے ہیں۔

(۵) اپنے پروگرام کو مبہم رکھنے کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ عوام سے ہر وقت یہ کہتے رہا جائے کہ۔۔ وہ آئی 'لو وہ آئی' دل ناصبور صبح۔۔ ان سے کہا جائے کہ اب منزل دور نہیں۔ بس تھوڑی سی ہمت اور کرو۔ یہ تھوڑے بہت تعمیری نشانات جو باقی رہ گئے انہیں جلدی سے تباہ کر دو۔ اس کے بعد زندگی کا نقشہ بدل جائے گا۔ عوامی تحریک میں (Tempo) کا برقرار رکھنا نہایت ضروری ہوتا ہے اور یہ اسی صورت میں قائم رہ سکتا ہے جب اپنے متبعین سے کہا جائے کہ منزل دور نہیں۔ اس ضمن میں اس گدھے کی مثال نہایت برجستہ ہے جس کی گردن میں چھوٹی سی لکڑی باندھ کر اس کے اگلے سرے پر گاجر لٹکا دیتے ہیں۔ اس میں ٹیکنیک یہ ہوتی ہے کہ اس گاجر کو گدھے کی آنکھ سے ذرا ہی دور رکھا جاتا ہے۔ اگر اسے لمبے فاصلے پر رکھا جائے تو گدھا اس فریب میں نہیں آ سکتا۔ اسی لئے عوام سے کہا جاتا ہے کہ تم اقتدار ہمارے ہاتھ میں دو؟ پھر دیکھو کہ ہم کس طرح اس نظام کو کل ہی واپس لے آتے ہیں جسے دیکھنے کو تمہاری آنکھیں ترستی ہیں۔

(۶) عوامی تحریک کی کامیابی کے لئے ضروری ہے کہ ان لوگوں کے دل میں یہ خیال راسخ کر دیا جائے کہ حق وصداقت کی حامل صرف ان کی جماعت ہے۔۔ ان کی تحریک دنیا بھر کی خوبیوں کی واحد مالک ہے۔ یہ خوبیاں کہیں اور نہیں مل سکتیں۔

(۷) عوامی تحریک میں وہ لوگ کشاں کشاں شامل ہو جاتے ہیں جن کے اپنے اندر کوئی خاص خوبی نہیں ہوتی۔ اس جماعت میں شامل ہونے کے بعد وہ یہ سمجھ لیتے ہیں کہ جتنی خوبیاں ان کی پارٹی میں بتائی جاتی ہیں وہ سب ان کے اپنے اندر موجود ہیں۔ اس طرح ان کا وہ نفسیاتی خلا پر ہو جاتا ہے جو خوبیوں کے فقدان کی وجہ سے ان کے اندر پیدا ہو گیا تھا اور جس کی وجہ سے وہ مختلف قسم کی نفسیاتی پیچیدگیوں (Complexes) کا شکار ہو رہے تھے۔ جس طرح ایک شخص پانی میں غوطہ زن ہو کر باہر کی دنیا سے بے خبر ہو جاتا ہے اسی طرح یہ لوگ اپنی پارٹی کے بحر ذخار میں ڈوب کر دنیا وما فیہا سے نہ صرف بے خبر ہو جاتے ہیں بلکہ ان کی طرف سے اپنے آپ کو مستغنی سمجھنے لگ جاتے ہیں۔

(۸) عوامی تحریک میں وہ لوگ بھی شامل ہو جاتے ہیں جو عام معاشرہ میں فٹ نہ ہو

سکنے کی وجہ سے اپنے آپ کو تنہا محسوس کرتے ہیں مثلاً سرکاری ملازم عام طور پر ساری عمر معاشرہ سے الگ تھلگ رہ کر گویا تھرماس (Thermos) میں زندگی بسر کرتے ہیں اور ریٹائرمنٹ کے بعد وہ اپنے آپ کو ایک لق و دق صحرا میں تنہا پاتے ہیں؟ اگر ان میں کوئی ایسے جوہر نہیں جن کی وجہ سے معاشرہ انہیں اپنا لے تو وہ اپنی تنہائی دور کرنے کے لئے عوامی تحریکوں میں شامل ہو جاتے ہیں اور یوں سمجھ لیتے ہیں کہ۔۔عشرت قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا۔۔!

(۹) عوامی تحریک کی کامیابی کے لئے امر لاینفک ہے کہ عوام کو مسلسل مصروف حرکت رکھا جائے۔ ان کو لگا تار چلاتے رہیں اور اتنی فرصت ہی نہ دیں کہ کسی جگہ کھڑے ہو کر سوچ سکیں کہ ہم کیا کر رہے ہیں اور ایسا کیوں کر رہے ہیں؟ اس کے لئے ضروری ہے کہ ہنگامے برپا کرنے کے لئے کوئی نہ کوئی عذر تراش لیا جائے۔ اس طرح مسلسل شور و شغب میں مصروف رہنے سے عوام کی سوچنے سمجھنے کی رہی سہی صلاحیتیں بھی مفقود ہو جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جو شخص عوامی تحریک کے نشہ کا خوگر ہو جائے وہ کسی فکری تحریک کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ اگر وہ کسی ایک عوامی تحریک سے الگ ہوگا تو کسی دوسرے عوامی تحریک ہی میں شامل ہوگا۔ چونکہ اسے سکھایا ہی یہ گیا تھا کہ عمل نام ہے ہنگامہ آرائی اور غوغہ آرائی کا اس لئے وہ فکری تحریک کو بے عملوں کی جماعت قرار دیتا ہے اور اس کی طرف رخ نہیں کرتا۔

(۱۰) مسلسل ہنگامہ آرائیوں سے عوام کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کو شل اور ان کے دل میں یہ خیال راسخ کر دینے سے کہ حق و صداقت کی اجارہ دار صرف ہماری پارٹی ہے ان میں وہ اندھی عقیدت پیدا کر دی جاتی ہے جسے (جیسا کہ میں نے پہلے بھی کہا ہے) انگریزی زبان میں (Faith) کہتے ہیں۔ (Faith) کی وضاحت برگسان نے بڑے جامع انداز میں کی ہے۔ جب کہا ہے کہ (Faith) یہ نہیں کہ اپنے متبعین کو دکھا دیا جائے کہ ہم پہاڑوں کو چلا دیتے ہیں۔ (Faith) یہ ہے کہ ایسا سحر پھونک دیا جائے کہ انہیں چلتے ہوئے پہاڑ بھی دکھائی نہ دیں۔ عوامی تحریک کے لیڈر کا کمال یہ ہے کہ وہ اپنے متبعین کی نگاہوں کو اس درجہ مسحور کر دے کہ جو حقائق دوسروں کو یونہی نظر آ جائیں ان کے متبعین لاکھ سمجھانے اور دکھانے پر بھی انہیں تسلیم نہ کریں۔

عوامی تحریک کے لیڈر

یہ تو رہے عزیزان من! عوامی تحریک (Mass Movement) کے لزوم و خصائص۔ جہاں تک اس تحریک کے لیڈر کا تعلق ہے اس کے اندر بھی چند ایک خصوصیات کا ہونا نہایت ضروری ہے۔ مثلاً:-

(۱) وہ اصول پرستی کی جگہ حکمت عملی کو اپنا مسلک قرار دے یعنی اپنے مقاصد کے حصول کے لئے جس مصلحت کا تقاضا ہو بلا جھجک ویسا کر گزرے خواہ اصولوں کا تقاضا کچھ ہی کیوں نہ ہو لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنے متبعین کو یہ باور کرادے کہ اس میں کوئی اصول شکنی نہیں ہوئی۔

(۲) اسے اس کا کبھی احساس نہ ہو کہ میں نے کل کیا کہا تھا اور آج کیا کہہ رہا ہوں۔ اس ''کہہ مکرنے'' کی روش کے متعلق وہ اپنے متبعین کو یہ کہہ کر مطمئن کرادے کہ جنگ میں ہر قسم کا حربہ جائز ہوتا ہے۔

(۳) وہ سرکشی اور قانون شکنی میں لذت محسوس کرے اور اپنے مخالفین کو ذلیل اور حقیر کر کے خوش ہو۔ خواہ اس کے لئے اسے دوسروں کے خلاف کیسے ہی جھوٹے الزامات کیوں نہ تراشنے پڑیں۔۔ اس طرح دوسروں کو ذلیل کرنا اس کے متبعین کے نزدیک بھی سب سے بڑا احسن عمل قرار پائے گا اور وہ اسے اپنی بہت بڑی کامیابی سمجھیں گے۔

(۴) اس کے لئے ایسا ضدی ہونا ضروری ہے کہ وہ نہ اپنی کسی غلطی کا اعتراف کرے نہ کسی دوسرے کی بات مانے۔ وہ اپنے آپ کو ہمہ دان اور محیط کل سمجھے۔

(۵) اس کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنی تحریک کی قیادت کو اپنی ذات تک محدود' اور اس طرح' اسے (One Man Show) بنائے رکھے۔ اس لئے وہ اپنی تحریک میں ایسے لوگوں کو کبھی بار نہیں پانے دے گا۔ جن کے متعلق اسے خطرہ ہو کہ وہ کل کو اس کے ہم دوش ہو جائیں گے۔

میں نے شروع میں کہا تھا کہ عوامی تحریک کی بنیاد' طبقاتی تفاوت کی شدت احساس پر ہوتی ہے۔ اس تفریق کو کم اور رفتہ رفتہ ختم کرنے کا فکری اور تعمیری طریق یہ ہے کہ نچلے طبقے کی سطح کو اس قدر بلند کیا جائے کہ اوپر اور نیچے کی تفریق باقی نہ رہے۔ قرآن کریم نے جنت کی زندگی کا جو نقشہ پیش کیا ہے اس میں طبقاتی تفاوت کو اسی طرح مٹایا گیا

ہے۔ اس میں محلات کو گرا کر جھونپڑیوں میں تبدیل نہیں کیا گیا۔ اس میں جھونپڑیوں کو ابھار کر محلات کے برابر لایا گیا ہے لیکن عوامی تحریک میں مشتعل ہجوم ہر تعمیر کو گرا کر زمین کے ہموار کر دیتا ہے اور اس طرح خوش ہو جاتا ہے کہ ہم نے مساوات پیدا کر دی ہے۔ حالانکہ یہ وہ مساوات ہے جس کا مکمل ترین نمونہ قبرستان میں ملتا ہے یا گھٹا ٹوپ اندھیرے میں۔۔ اندھیرے میں نشیب و فراز بالکل نظر نہیں آتے۔ سب تاریکی کی چادر میں گم ہو جاتے ہیں۔

یہ ہیں عزیزانِ من! وہ عناصر جن سے ایک عوامی تحریک ترتیب پاتی ہے اور یہ ہیں وہ محرکات جن کے بل بوتے پر وہ زندہ رہتی ہے یعنی یہ کہ عقل و فکر کے چراغوں کو گل کر کے عوام کے جذبات کو مشتعل کیا اور مضطرب رکھا جائے اور معاشرہ میں مسلسل خلفشار و انتشار (Chaos) برپا کیا جائے اور ایسا کرنے کو خدائی فریضہ قرار دیا جائے۔

کوئی تعمیری کام نہیں

میں یہ عرض کر رہا تھا کہ پاکستان کے وجود میں آنے کے ساتھ ہی یہاں مذہب کے نام پر ایک عوامی تحریک کی طرح ڈال دی گئی۔ ملک میں بدقسمتی سے غلط نظام زندگی اور اربابِ نظم و نسق کی بدعنوانیوں سے جوں جوں عوام کی حالت خراب سے خراب تر ہوتی گئی یہ تحریک بھی بڑھتی چلی گئی اور اس کے ساتھ ہی اس کے تخریبی نتائج بھی ابھرتے چلے گئے۔ آپ اس تحریک کی تاریخ پر غور کیجئے۔ آپ کو اس میں کوئی تعمیری کام دکھائی نہیں دے گا۔ اس کے برعکس اس حقیقت سے ہر شخص آگاہ ہے کہ انہوں نے اس تمام عرصہ میں ایک دن بھی ملک کو چین سے نہیں بیٹھنے دیا۔ یہ مسلسل (Chaos Create) کرتے رہے۔

بحالی جمہوریت

یہ تحریک بڑھتی تو گئی لیکن جن خوش آیند وعدوں سے عوام کو اپنے پیچھے لگایا گیا تھا ان کے ایفا ہونے میں اتنا لمبا عرصہ لگ گیا کہ اس کے بعد اس کا (Tempo) قائم رکھنا مشکل ہو گیا۔ اس وجہ سے اسے اپنا رخ دوسری طرف موڑنا پڑا اور ''بحالی جمہوریت'' کے نام سے اس میں نیا ایندھن ڈالا گیا اور پھر اس روڈ رولر نے جس میں کوئی ڈرائیور نہیں تھا جو تباہی مچائی اس کے نشانات اب تک اس ملبے کی شکل میں ہمارے سامنے ہیں جس کے نیچے علم و عقل، ہوش و خرد اور تہذیب و شرافت کی لاشوں کو دبایا گیا ہے[1]

---

[1] یہ پڑھتے وقت اسے فراموش نہ کیجئے کہ یہ خطاب ۶۹-۱۹۶۸ء کے ہنگاموں کے بعد ۱۹۷۰ء میں پیش کیا گیا تھا۔ (طلوع اسلام)

عزیزان من! میں کہہ یہ رہا ہوں اور میری چشم تصور کے سامنے بعض پیشانیوں کی وہ خشم آلود شکنیں آ رہی ہیں جو انتہائی غم وغصہ کے عالم میں مجھ سے کہہ رہی ہیں کہ کیا تمہیں اس کا افسوس ہے کہ وہ غلط نظام کیوں مٹ گیا؟ میں اس سوال کا تفصیلی جواب تو ذرا آگے چل کر دوں گا۔ یہاں صرف اتنا کہہ کر آگے بڑھ جانا چاہتا ہوں کہ میں اس غلط نظام کے مٹنے کا افسوس نہیں کر رہا غلط نظام کو مٹنا ہی چاہئے مجھے افسوس ہے اس غلط طریق کا جو اس غلط نظام کو مٹانے کے لئے اختیار کیا گیا تھا۔ غلط کو غلط سے مٹایئے تو غلط پھر بھی موجود رہے گا۔ صرف اس کے پیکر میں فرق آ جائے گا۔

☆☆☆☆☆☆☆

ہماری پوزیشن

یہ ہے وہ مقام جہاں عزیزان من! ہم اس وقت کھڑے ہیں۔ میں یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میرا تعلق نہ کسی مذہبی فرقہ سے ہے اور نہ کسی سیاسی پارٹی سے۔۔ میں قرآن کریم کا ایک ادنیٰ طالب علم ہوں اور قرآن کی رو سے' مذہبی فرقوں کا وجود شرک ہے اور سیاسی پارٹیاں حکمت فرعونی کی مظہر۔ میری تحریک یکسر فکری ہے اس لئے ہم عملی سیاسیات میں بھی حصہ نہیں لیتے۔ میں نے جو کچھ آپ کی خدمت میں عرض کیا ہے وہ نہ کسی پر تنقید ہے نہ کسی کی تنقیص۔ یہ میری قرآنی بصیرت کے مطابق یہاں کے حالات کا معروضی۔۔(Objective) تجزیہ ہے۔ مجھے دین سے عشق ہے اور پاکستان سے اس لئے محبت کہ یہ سرزمین دین کا نظام قائم کرنے کے لئے حاصل کی گئی تھی اور اس کے حصول کی جدوجہد میں' میں نے بھی اپنی بساط کے مطابق حصہ لیا تھا۔

قوم کو قانون کا احترام سکھائیں

تاریخ اس حقیقت کی شہادت دیتی ہے کہ جو تحریکیں' عقل وفکر کے چراغ بجھانے کے لئے جھکڑ بن کر اٹھیں' انہوں نے انسانی تہذیب وتمدن کی عمارات کو تباہ کر کے رکھ دیا۔ اس سیلاب بے پناہ کا مقابلہ وہ سلطنتیں پھر نہ کر سکیں جو صدیوں سے پہاڑوں کی طرح محکم چلی آ رہی تھیں۔ اس لئے مملکت پاکستان جو ابھی اپنے عہد طفولیت میں ہے اس کا کیا مقابلہ کر سکے گی۔۔ جب ۶۹۔۱۹۶۸ء کے ہنگامے پورے زوروں پر تھے تو میں نے ان کے آتش برداروں کی خدمت میں عرض کیا تھا کہ آپ قوم کو قانون شکنی کا خوگر نہ

بنائیں۔ انہیں قانون کا احترام سکھائیں۔ قانون شکنی دو دھاری تلوار ہوتی ہے۔ جب بیگانے اس کا شکار ہو چکتے ہیں تو پھر یہ اپنوں کے خلاف اٹھنی شروع ہو جاتی ہے۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ جب ۱۹۴۲ء میں مسٹر گاندھی نے (Quit India) کی تحریک شروع کی اور قوم کو قانون شکنی کے لئے بے باک چھوڑ دیا تو اس نے قائداعظمؒ کو دعوت دی تھی کہ جب انگریز کی غلامی سے نجات حاصل کرنے کا ہمارا اور آپ کا مقصد ایک ہے تو آپ بھی اس تحریک میں شامل ہو جائیے یا کم از کم اس کی تائید کیجئے۔ اس کے جواب میں قائداعظمؒ نے فرمایا تھا کہ گاندھی جی قوم کو قانون کا احترام سکھائیے۔ قانون شکنی کا سبق نہ پڑھائیے۔ ایک دفعہ قوم کو اس کی عادت پڑ گئی تو آج جس سیلاب کا رخ انگریز کی طرف ہے کل کو اس کا رخ خود آپ کی سمت ہو جائے گا۔ اس وقت اس کے سامنے بند باندھنا آپ کے بھی بس میں نہیں رہے گا۔ یہی کچھ میں نے اپنے ہاں کے ان لیڈروں کی خدمت میں عرض کیا تھا جو اس وقت قوم کو قانون شکنی کے لئے ابھار رہے اور اس کے اس عفریتی رقصِ آتشیں پر جشنِ مسرت منا رہے تھے۔ میں نے کہا تھا کہ الٰہ دین کے چراغ کے اس جن کو بوتل سے نہ نکالئے۔ یہ ایک دفعہ باہر نکل آیا تو اسے دوبارہ بوتل میں بند کرنا خود الٰہ دین کے بس کی بات بھی نہیں ہوگی لیکن قوت کے نشہ کی مدہوشی اس قسم کے مشوروں کو کب درخور اعتنا سمجھتی ہے۔ انہوں نے قانون شکنی کی جی بھر کر داد دی۔ ان عناصر کو قوم کا ہیرو قرار دیا۔ اب حالت یہ ہے کہ جب وہی قانون شکنی کے خوگر عناصر ان کے خلاف اٹھتے ہیں تو یہ چیخنے لگ جاتے اور فریاد کرتے ہیں کہ انہیں روکئے لیکن اب انہیں کون روک سکتا ہے!

جو آگ لگائی تھی تم نے اس کو تو بجھایا اشکوں نے
جو اشکوں نے بھڑکائی ہے اس آگ کو ٹھنڈا کون کرے

اور اس کا خمیازہ ساری قوم بھگت رہی ہے۔ اس وقت پورا معاشرہ لاقانونیت (Lawless Ness) کی زد میں آ رہا ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆

باطل کے نظام

قرآن کریم جس دین کو نوعِ انسانی کے لئے باعث برومندی قرار دیتا ہے اس کی رو سے ہر وہ نظام جو انسانیت کی فوز و فلاح کے راستے میں حائل ہو، باطل، فاہذا ابلیسی

ہے۔ جیسا کہ میں نے شروع میں عرض کیا تھا، اصولی طور پر وہ اس نظام کو تین شقوں میں تقسیم کرتا ہے۔۔ وہ سیاسی نظام جس میں ایک انسان کسی دوسرے انسان یا انسانوں کے گروہ کے احکام کی اطاعت پر مجبور ہو، اسے دورِ حاضرہ کی اصطلاح میں، سیکولر نظام کہا جاتا ہے جس کا نمائندہ فرعون تھا۔ دوسرے اندھی عقیدت کا وہ نظام جس میں انسانوں کا ایک گروہ، دوسرے انسانوں کی فکری صلاحیتوں کو مفلوج کر کے، ان کے قلب و دماغ پر اپنی حکمرانی مسلط کر دے۔ اسے مذہبی پیشوائیت کا نظام کہا جاتا ہے جس کا نمائندہ ہامان تھا اور تیسرے وہ معاشی نظام جس میں ایک انسان، روٹی کے لئے دوسرے کا محتاج ہو جائے۔ اسے نظام سرمایہ داری سے تعبیر کیا جاتا ہے جس کا نمائندہ قارون تھا۔ قرآن کی رو سے، دین کا نظام قائم نہیں ہیں۔

داخلی تبدیلی

وہ اس کا طریقہ فکری تحریک تجویز کرتا ہے جس میں قلب و دماغ کی داخلی تبدیلی سے خارجی احوال وظروف میں تبدیلی پیدا کی جاتی ہے تبدیلی پیدا کیا کی جاتی ہے قلب و نگاہ کی تبدیلی کا فطری نتیجہ خارجی ماحول کی تبدیلی ہوتا ہے۔ قرآن کریم نے اس بنیادی حقیقت کو ان بصیرت افروز الفاظ میں بیان کیا ہے کہ۔۔

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ (۱۳/۱۱)

جب تک کوئی قوم اپنی داخلی (نفسیاتی) دنیا میں تبدیلی نہیں پیدا کرتی، خدا اس کے خارجی احوال میں تبدیلی پیدا نہیں کرتا۔

اقبالؒ کے الفاظ میں:۔

یکہ منزل را نمی دانی ز راہ   قیمتِ ہر شے ز اندازِ نگاہ
نوع دیگر بیں، جہاں دیگر شود   ایں زمین و آسماں دیگر شود

قرآن کا مقصد انسانی قلب و نگاہ میں اس قسم کی تبدیلی پیدا کرنا ہے۔ اقبالؒ ہی کے الفاظ میں:

فاش گویم آنچہ در دل مضمر است   ایں کتابے نیست چیزے دیگر است
چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود   جاں چو دیگر شد جہاں دیگر شود

نوعِ انسانی کا وہ عظیم ترین انقلاب جو آج سے چودہ سو سال پہلے حضور نبی اکرمؐ اور آپؐ کے رفقائے جلیل کے مقدس ہاتھوں سے رونما ہوا تھا اس کے لئے یہی طریق اختیار کیا گیا تھا۔۔ اس مقام پر میں اتنا اور واضح کر دوں کہ قرآن کریم کی رو سے کسی مقصد اور اس کے حصول کے طریق میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ (Means Are Justified By Ends Achieved) میکاولی سیاست کا اصول ہے' قرآن کا نہیں۔قرآن کی رو سے غلط راستہ صحیح منزل تک کبھی نہیں پہنچا سکتا۔اس لئے قرآنی انقلاب میں جہاں صحیح منزل کا تعین حق کے مطابق ہونا چاہئے اس کے حصول کا طریق بھی مبنی برحق ہونا چاہئے۔اس انقلاب کے لئے جس کی طرف میں نے ابھی ابھی اشارہ کیا ہے حضورؐ نبی اکرم نے اپنی دعوت کا آغاز کیا تو اس وقت (حضورؐ کے سوا) دنیا میں کوئی مسلمان نہیں تھا۔آپؐ نے اس نظام نو کے اصول و اقدار اپنی قوم کے سامنے پیش کئے اور پیش کرتے چلے گئے۔قوم نے اس دعوت کی مخالفت کی لیکن ان میں ایسے افراد بھی تھے جنہوں نے اس پر سکون و اطمینان سے غور و فکر کیا اور اس کے بعد جب وہ اس کی صداقت کے متعلق دل اور دماغ کی کامل رضا مندی سے مطمئن ہو گئے تو انہوں نے اسے قبول کرنے کا اقرار کیا اور اس طرح اس سوسائٹی کے ممبر بن گئے جس کی طرف حضورؐ دعوت دیتے تھے۔

جو لوگ اس طرح اس سوسائٹی کے ممبر بنتے تھے ان کی تعلیم و تربیت کا خصوصی انتظام خود نبی اکرمؐ فرماتے تھے۔قرآن کریم نے جو حضورؐ کی یہ خصوصیت کبریٰ بیان کی ہے کہ: **يُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ**۔ تو وہ اسی حقیقت کی وضاحت کرتی ہے۔یعنی حضورؐ انہیں اس نظام کے قوانین و ضوابط کی تعلیم دیتے تھے۔اس کی حکمت و غایت سے آگاہ کرتے تھے اور اس کے ساتھ ہی ان کی انسانی صلاحیتوں کی نشو و نما کرتے چلے جاتے تھے۔''صلاحیتوں کی اس نشو و نما'' سے مراد صرف ذہنی صلاحیتیں نہیں' اس سے مفہوم ان صلاحیتوں کی نشو و ارتقاء بھی ہے۔جن کی بنیادوں پر انسانی سیرت و کردار کی بلند و بالا عمارت استوار ہوتی ہے۔اسے انسانی ذات کی نشو و نما کہا جاتا ہے۔ اسی سے ابن آدم حیوانی سطح سے بلند ہو کر انسانی سطح پر زندگی بسر کرنے کے قابل ہوتا ہے اور یہی چیز جذبہء محرکہ بنتی ہے اس عظیم ایثار کا جس پر اس نظام کی عمارت استوار ہوتی

اس جماعت کے افراد کو مومن کہا جاتا تھا۔ یعنی وہ لوگ:

(۱) جنہوں نے سوچ سمجھ اور دیکھ بھال کر، برضا و رغبت، اس نظام کی صداقت کو قبول کیا اور

(۲) ان کی تعلیم و تربیت خود رسول اللہؐ نے فرمائی اور اس طرح ان کے قلب و نگاہ میں قرآنی اقدار کے مطابق انقلاب پیدا ہوتا چلا گیا۔

رسول اللہؐ کی مکی زندگی پوری کی پوری اسی عمل تزمیل[1] (جماعت سازی) میں بسر ہوگئی اور تیرہ سال کے عرصہ میں جو افراد اس سوسائٹی کے رکن بنے ان کی تعداد چند سو سے زیادہ نہ تھی۔ اگر ہم اپنے اندازوں کے مطابق ماپیں تو یہ پروگرام بڑا سست خرام دکھائی دے گا۔ آپ غور کیجئے کہ حضورؐ کی عمر رسالت صرف تئیس سال تھی اور آپ کا عہد رسالت قیامت تک کے عرصہ کو محیط تھا۔ اس اعتبار سے حضورؐ کی حیات طیبہ کا ایک ایک سانس صدیوں پر بھاری تھا۔ اس تئیس سال کے گراں بہا عرصہ میں سے تیرہ سال کی مدت ابتدائی عمل تزمیل میں صرف ہوگئی اور اس کا ماحصل چند سو افراد سے آگے نہ بڑھا اور حضورؐ کی طرف سے یہ سب کچھ نہایت سکون و سکوت کے ساتھ ہوا۔ جو حضرات بنیادی نظریات کی تبلیغ و تعلیم کے مرحلہ کو "بے عملی" سے تعبیر کرتے ہیں اور عمل کا تصور ان کے ہاں ہنگامہ خیزی اور شورش انگیزی ہوتا ہے، ان کے نزدیک حضورؐ کی یہ تیرہ سالہ زندگی تو "بے عملی" کا دور کہلائے گی۔

اس جماعت مومنین کی مکی زندگی ایک اور اہم حقیقت کی بھی پردہ کشا ہے۔ لوٹ مار، جنگ و جدال، فتنہ و فساد، عربوں کی گھٹی میں پڑا تھا، اور اس جماعت نو کے افراد انہی عربوں میں سے تھے۔ اس تیرہ سال کے عرصہ میں اس جماعت کے افراد پر ہر قسم کے مظالم ہوئے۔ انہیں ناقابل برداشت تکالیف اور مصائب کا سامنا کرنا پڑا لیکن ان میں سے کسی نے نہ کسی قسم کا دنگا فساد کیا نہ لڑائی جھگڑا۔ نہ کسی کو لوٹا نہ کھسوٹا۔ نہ کہیں پتھراؤ کیا نہ گھیراؤ۔ حتیٰ کہ نہ کہیں جھوٹ بولا نہ کسی کو فریب دیا۔ نہ کسی سے بدمعاملگی کی نہ کسی قسم کی عہد شکنی۔ تکلیفیں برداشت کرتے رہے۔ مصیبتیں اٹھاتے رہے لیکن فریق مقابل کے خلاف نہ جھوٹا پراپیگنڈہ کیا نہ کسی قسم کی غلط بیانی سے کام لیا۔ نہ کوئی سازش کی نہ زمین دوز تحریک چلائی۔ جو کچھ کہا کھلے بندوں کہا۔ جو کچھ کیا علی الاعلان کیا۔ اپنے کام سے کام رکھا

---

[1] رسول اللہ کو اسی جہت سے قرآن میں المزمل کہا گیا ہے یعنی وہ جو رفقائے سفر کے انتخاب میں انتہائی کاوش و [illegible]

اور جب دیکھا کہ مکہ کے مقابلہ میں مدینہ کی فضا اس نظام کے قیام کے لئے زیادہ سازگار ہے تو نہایت خاموشی سے ہجرت کر کے وہاں چلے گئے اور جاتے وقت بھی نہ کسی کو کسی قسم کا دھوکہ دیا نہ خیانت کی۔

مدینہ گئے تو وہاں کسی سے حکومت نہیں چھینی۔ نہ ہی ایسا ہوا کہ کوئی بنی بنائی حکومت کسی نے ان کے حوالے کر دی ہو۔ وہاں انہوں نے اپنی مملکت قائم کی۔۔ ''مملکت قائم کی'' کے الفاظ ذرا وضاحت طلب ہیں۔ سوال یہ ہے کہ یہ مملکت قائم کس طرح سے کی گئی تھی۔ اس کے لئے طریق کار کیا اختیار کیا گیا تھا۔ اس سلسلہ میں قرآن پھر ایک اصول بیان کرتا ہے اور وہ اصول ایسا جامع ہے جس میں تمام تفاصیل خود بخود سمٹ کر آ جاتی ہیں۔ سورۃ النور میں ہے۔ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ (۲۴/۵۵) یعنی یہ مملکت نہ کسی سے چھین جھپٹ کر لی گئی تھی نہ کسی نے بطور بخشائش ہبہ کر دی تھی۔ یہ فطری نتیجہ تھی ان کے ایمان اور اعمال صالحہ کا ایمان یعنی اپنے نصب العین کی صداقت پر یقین محکم اور اعمال صالحہ۔ قرآنی اقدار و اصول کے اندر رہتے ہوئے مناسب اقدامات۔

جب یہ جماعت یوں صاحب اقتدار ہو گئی تو معاشرہ میں نظام اسلامی خود بخود نافذ ہو گیا۔ بالفاظ دیگر یوں کہئے کہ یہ کاروان مختلف وادیوں میں سے گزرنے کے بعد اپنی منزل مقصود تک جا پہنچا۔ اس وقت نہ کسی نے یہ سوال اٹھایا کہ مملکت تو مل گئی ہے اب اس میں کس قسم کا نظام قائم کیا جائے نہ یہ تنازعہ پیدا ہوا کہ فلاں قسم کا معاشی نظام اسلامی ہے یا غیر اسلامی۔۔ انہوں نے چلنے سے پہلے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ ہم نے پہنچنا کہاں ہے۔ اس لئے منزل پر پہنچنے کے بعد، کسی کے دل میں یہ سوال نہ ابھرا کہ یہ میری منزل مقصود ہے یا نہیں۔ ان میں سے ہر فرد جو اس سوسائٹی کا ممبر بنا تھا، سب کچھ دیکھ بھال کر، سوچ سمجھ کر ممبر بنا تھا۔ ان میں سے ہر ایک کو معلوم تھا۔ حتمی اور یقینی طور پر معلوم کہ اس سوسائٹی کا مقصد و منتہیٰ کیا ہے اور اس مقصد کے حصول کے لئے ہمارا فریضہ کیا۔ یہ افراد اس سوسائٹی کا ممبر بننے کے بعد اپنے آپ کو اس مقصد کے حصول کے لئے تیار کرنے اور اس کے اہل بننے میں مصروف رہے۔ جب انہوں نے اپنے اندر اس کی اہلیت پیدا کر لی تو مقصد حاصل ہو گیا یعنی اسلامی نظام قائم ہو گیا۔ اس کے بعد یہ لوگ اس نظام کے استحکام و فروغ اور

اندرونی اور بیرونی خطرات سے اس کی حفاظت و مدافعت کے لئے مصروف جدوجہد رہے۔ یہ ہے وہ طریق جس کے مطابق صدر اول میں یہ نظام قائم ہوا۔ یعنی اس نظام کے اصول و اقدار کو بہ دلائل و براہین دوسروں کے ذہن اور دل نشین کرانا اور جو اس طرح ان کی صداقت تسلیم کر لیں، مناسب تعلیم و تربیت سے ان کی انسانی صلاحیتوں کو اجاگر کرنا اور یہی طریق ہر اس شخص اور اس جماعت کو اختیار کرنا ہوگا جو صحیح اسلامی نظام کے قیام کی داعی ہو۔

☆☆☆☆☆☆☆

نوجوانوں کا اضطراب

اس مقام پر ہمارا نوجوان طبقہ (جس کے جذبات کو مسلسل مشتعل کیا جا رہا ہے) تلملا اٹھتا ہے اور کہتا ہے کہ ملک میں غریبوں پر گوشہء عافیت تنگ ہو رہا ہے۔ انہیں زندگی کے دن گزارنے مشکل ہو رہے ہیں۔ نہ ان کے پاس کھانے کو روٹی ہے، نہ پہننے کو کپڑا، نہ رہنے کو مکان ہے نہ علاج کے لئے چار پیسے۔ ان پر ہر طرف سے مظالم ٹوٹ رہے ہیں۔ ان کے حقوق تلف ہو رہے ہیں۔ ان غریبوں اور ناداروں کو روٹی کپڑے اور انصاف کی آج ضرورت ہے اور آپ ان سے کہہ رہے ہیں کہ اس وقت تک انتظار کرو جب تک قوم میں نفسیاتی تبدیلی نہ پیدا ہو جائے اور نہیں سمجھتے کہ۔۔ تا تریاق از عراق آوردہ شود مار گزیدہ مردہ شود۔۔

آہ کو چاہیئے اک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

مجھے اپنے ان عزیزوں کی بیتابی تمنا کا پورا پورا احساس ہے اور جہاں تک غریبوں کی مشکلات کا تعلق ہے انہیں شاید معلوم نہ ہو کہ ان بے انصافیوں کو ملک میں آج ابھارا گیا ہی اور میں گذشتہ بیس سال سے مسلسل اس کے لئے پکار رہا ہوں لیکن اس کے باوجود، میں ان نوجوانوں سے کہوں گا کہ تپ دق کا علاج راتوں رات نہیں ہو سکتا۔ اس کے لئے وقت درکار ہوتا ہے اور مریض اور تیمارداروں کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ وہ اس مدت کو صبر و تحمل سے گزاریں۔ اس قسم کی ایک اور مثال لیجئے۔۔ ایک کسان کے ہاں من بھر گندم بیج کے لئے رکھا ہے اور اس کے بچے بھوک سے بلک رہے ہیں۔ بچوں کی بھوک کا تقاضا ہے

کہ وہ اس گندم کو پسوا لائے اور بچوں کو روٹی کھلا دے۔ اس سے بچوں کی دو چار دن کی بھوک کا علاج تو ہو جائے گا لیکن اس کے بعد کیا ہوگا؟ ان کی بھوک کا مستقل علاج یہی ہے کہ بیج کو کھیت میں بویا جائے اور فصل پکنے تک کا انتظار کیا جائے اور اس دوران میں بچوں کی روٹی کا کوئی اور انتظام سوچا جائے۔

چین کی مثال

صحیح انقلاب کے لئے عزیزانِ من! وقت درکار ہوتا ہے اور ہماری ہزار تمناؤں اور آرزوؤں، بیتابیوں اور اضطرابیوں کے باوجود فطرت اپنے قانون میں کبھی تبدیلی نہیں کرتی۔ جس غالب نے یہ کہا تھا کہ۔۔ کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک۔۔ تو اسے اس کا بھی احساس تھا کہ۔۔ عاشقی صبر طلب اور تمنا بیتاب۔۔ ہماری بیتابیٔ تمنا عشق کی صبر طلبی کے تقاضوں کا بدل نہیں بن سکتی۔ ہمارے یہ نوجوان چین کی مثال پیش کر دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ دیکھئے! انہوں نے چند دنوں میں کتنا بڑا انقلاب برپا کر دیا۔ ان کی بھول یہ ہے کہ وہ اس انقلابی جدوجہد کی مدت کو اس دن سے شمار کرتے ہیں جب وہ محسوس طور پر دنیا کے سامنے آیا۔ جس زمانے میں وہ لوگ نہایت خاموشی سے اس کی تیاریوں میں مصروف تھے وہ ان کی نگاہوں سے اوجھل ہوتا ہے۔

ایک جلنے کے سوا اور کوئی کیا جانے
حالتیں کتنی گذر جاتی ہیں پروانے پر

چین کے مشہور مجلہ پیکنگ ریویو کی ۲۰ مارچ ۱۹۷۰ء کی اشاعت میں انقلاب چین کے قائد ماؤزے تنگ کا ایک مقالہ شائع ہوا تھا۔ اس میں اس نے لکھا تھا۔

> دانشوروں کا مسئلہ آئیڈیالوجی کا مسئلہ ہے اور آئیڈیالوجی سے متعلق مسائل کو حل کرنے کے لئے جبر و استبداد کے بھونڈے طریقے نہ صرف یہ کہ مفید نہیں ہوتے بلکہ (تحریک کے لئے) نقصان رساں ہوتے ہیں۔ ہمارے رفقاء کو معلوم ہونا چاہئے کہ نظریاتی تبدیلی کے لئے بڑے طویل المیعاد، صبر آزما اور استقامت طلب پروگرام کی ضرورت ہوتی ہے۔ انہیں یہ نہیں سمجھ لینا چاہئے (اور نہ ہی ایسی کوشش کرنی چاہئے) کہ وہ محض چند لیکچروں اور جلسوں سے لوگوں

> کے نظریات میں تبدیلی پیدا کر دیں گے۔ قوموں کے نظریات صدیوں میں جا کر مرتب ہوتے ہیں اس لئے انہیں راتوں رات بدلا نہیں جا سکتا۔ یہ کام جبر و استبداد سے نہیں ہو گا۔ لوگوں کے قلب و دماغ کو رفتہ رفتہ اس تبدیلی کے لئے آمادہ کرنا ہو گا۔

آپ سوچئے کہ جب اس انقلاب کے لئے جسے محض خارجی معاشرہ میں برپا کرنا مقصود ہو' اس قسم کے طویل المیعاد صبر آزما پروگرام کی ضرورت ہوتی ہے تو اس انقلاب کے لئے جس میں انسان کے غلط معتقدات' نظریات' تصورات' اعمال و افکار کو صحیح نظریات سے بدلنا اور انسانی سیرت و کردار کے ہر گوشے کو ایک جدید قالب میں ڈھالنا مطلوب ہے' کس قدر سکون و ثبات کے ساتھ صبر آزما مراحل میں سے گزرنا ہو گا لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ آپ غریبوں اور محتاجوں کی مصیبتوں کو علیٰ حالہ رہنے دیں اور ان کی کوئی مدد نہ کریں۔ جو کچھ میں کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ آپ اپنا نصب العین قرآنی نظام رکھیں جس میں ہر نوع کی غلامی کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ اس نصب العین تک بتدریج پہنچا جائے گا۔ اس لئے اس کی طرف اس طرح قدم بڑھایئے کہ ملک میں فساد نہ برپا ہونے پائے اور ضرورت مندوں کی مرفہ الحالی کی شکلیں نکلتی چلی جائیں اس کے لئے ضروری ہے کہ قوم کے نوجوانوں کے دل میں قانون شکنی اور سرکشی کے جذبات ابھارنے کے بجائے انہیں قانون کا احترام سکھایا جائے۔ ان میں اخلاق حمیدہ کی آرزوؤں کو بیدار کیا جائے' ان میں معاملات کو ٹھنڈے دل سے سوچنے اور حل کرنے کی صلاحیت پیدا کی جائے۔ اگر پیش نظر مقصد موجودہ نظام میں (جیسا کچھ یہ ہے) اقتدار حاصل کرنا ہے تو اس کے لئے بھی نہایت پرامن آئینی طریق اختیار کیا جائے۔ ملک میں معاشی تبدیلی کے لئے قانونی اصلاحات کی طرف قدم اٹھایا جائے لیکن اسے اپنے پروگرام کا منتہیٰ نہ سمجھ لیا جائے۔ اسے محض عارضی تدبیر سمجھا جائے۔

ایمان بالآخرۃ

منتہیٰ...... افراد قوم کے قلب و دماغ میں صحیح قرآنی تبدیلی قرار دی جائے۔ اس تبدیلی کی بنیادی شرط ایمان بالآخرت ہے یعنی اس حقیقت پر کامل یقین کہ انسان کا کوئی عمل حتیٰ کہ اس کے دل میں گزرنے والے خیالات تک بھی اپنا نتیجہ پیدا کئے بغیر نہیں رہ

سکتے اور ان نتائج کا خمیازہ ہر انسان کو بھگتنا ہوگا خواہ وہ اس زندگی میں سامنے آ جائیں اور خواہ مرنے کے بعد۔ اس ایمان کے بعد قانون کی اطاعت یا مستقل اقدار کی پابندی نہ پولیس کے ڈر سے کی جائے گی نہ قید و بند کے خوف سے۔ یہ چیز اس شخص کے دل کی آواز اور زندگی کا تقاضا بن جائے گی۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے بتایا ہے کہ جسے اسلامی نظام کہتے ہیں وہ اس وقت قائم ہو گا جب کیفیت یہ ہو کہ یہ لوگ (اے رسولؐ!) اپنے ہر نزاعی معاملہ کے تصفیہ کے لئے تیری طرف رجوع کریں یعنی قانون کو اپنے ہاتھ میں نہ لے لیں بلکہ ہر معاملہ میں فیصلہ کرنے والی اتھارٹی کی طرف رجوع کریں اور اس کے بعد۔ **ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَ يُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا۔** (۴/۶۵) اور پھر جو فیصلہ تو دے اس کے سامنے اس طرح سر تسلیم خم کریں کہ ان کے دل کی گہرائیوں میں بھی اس کے خلاف کوئی گرانی محسوس نہ ہو۔

اسلامی نظام کے قیام کی شرط

جب تک معاشرہ میں یہ کیفیت پیدا نہ ہو آپ کسی نظام کو اسلامی نہیں کہہ سکتے خواہ اس کی شکل و صورت کیسی ہی اسلامی کیوں نہ دکھائی دے اور ظاہر ہے کہ قلب و نگاہ میں ایسی تبدیلی، ہنگامہ خیزیوں اور زور آزمائیوں سے پیدا نہیں ہوسکتی۔ یہ صرف فکری تحریک سے پیدا ہوسکتی ہے جس کا مقصد افراد معاشرہ کی قرآنی خطوط پر تعلیم و تربیت ہو۔ میں نے عزیزانِ من! جیسا کہ پہلے بھی عرض کیا ہے تحریک پاکستان میں، اپنی بساط کے مطابق حصہ لیا تو اس لئے کہ میرا ایمان تھا کہ اسلام ایک زندہ نظام حیات اسی صورت میں بن سکتا ہے جب اس کی اپنی آزاد مملکت ہو اور قرآن کریم پر غور و تدبر سے یہ حقیقت بھی مجھ پر واضح ہوگئی تھی کہ اپنی آزاد مملکت میں اسلامی نظام اسی صورت میں قائم ہوسکتا ہے جب نونہالان ملت کی تعلیم و تربیت قرآنی خطوط پر کی جائے جس سے ان کی کیفیت یہ ہو جائے کہ مستقل اقدار خداوندی کی پابندی ان کی زندگی کا داخلی تقاضا بن جائے اور اس کے خلاف ان کے دل کی گہرائیوں میں بھی کوئی گرانی محسوس نہ ہو۔ میں نے اس کے لئے طلوع اسلام کی فکری تحریک کی بنیاد رکھی جو بتوفیق ایزدی اس بائیس[1] سال کے عرصہ میں کامل سکوت و سکون سے اس طرح آگے بڑھتی چلی گئی جس طرح طلوع ماہتاب کے ساتھ چاندنی کی حسین چادر نہایت خاموشی سے فرش صحرا پر بچھتی اور پھیلتی چلی جاتی ہے یا گوئے

[1] یہ ۱۹۷۰ء کی بات ہے۔ اب یہ تحریک بعونہٖ تعالیٰ اور بھی زیادہ پھیل چکی ہے۔ (طلوع اسلام)

کے ''نغمۂ محمدؐ'' میں اس آسمانی ندی کی طرح' جسے اقبالؒ نے ان الفاظ سے دو آتشہ کر دیا ہے کہ

بنگر کہ جوئے آب چہ مستانہ می رود
باخود یگانہ' از ہمہ بیگانہ می رود

اس تحریک نے کبھی کسی ہنگامے میں حصہ نہیں لیا۔ اس نے قوم کو سوچنا سکھایا۔۔ اور قرآنی روشنی میں سوچنا سکھایا۔ پاکستان آنے کے بعد میں نے قوم سے کہا کہ ہم جس قسم کے بھی مسلمان ہیں ہمارا فریضہ یہ ہونا چاہئے کہ ہم اس خطہ پاک کو بیرونی خطرات سے محفوظ اور اندرونی خلفشار سے مامون رکھیں۔

تعلیمی نظام

اس کے ساتھ ہمیں اپنی آنے والی نسلوں کی تعلیم و تربیت کا ایسا انتظام کرنا چاہئے جس سے وہ اسلامی زندگی کا پیکر بن کر ابھریں۔ اس سلسلہ میں' میں نے پاکستان میں مروجہ طریق ونصاب تعلیم میں تبدیلی کی طرف قوم کی توجہ بالعموم اور ارباب حل وعقد کی بالخصوص مبذول کرائی۔۔ اور اپنی اس کوشش کو مسلسل جاری رکھا لیکن مجھے انتہائی افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ یہ حضرات اپنے اپنے مقاصد میں منہمک رہے اور جس مسئلہ پر قوم اور پاکستان کے مستقبل کا انحصار تھا اس کی طرف کسی نے توجہ نہ دی۔ ہم آج جس قوم کے ہاتھوں اس قدر نالاں ہیں یہ قوم سرِ بخ سے نہیں ٹپک پڑی۔ یہ وہی قوم ہے جسے ہم بیس بائیس[1] سال سے اپنی درسگاہوں' اسکولوں کالجوں' مکتبوں' دارالعلوموں میں تیار کرتے رہے ہیں۔ اس قوم کو بنایا ہم نے خود ہی ایسا ہے اور جب یہ ایسی بن چکی ہے تو ہم اسے موردالزام ٹھہراتے ہیں کہ تم ایسی کیوں ہو؟ اور طرفہ تماشا یہ کہ ہم موجودہ قوم کے ہاتھوں نالاں بھی ہیں اور اسی قسم کی قوم تیار کرنے میں مصروف بھی! یعنی ہم اپنی مروجہ تعلیم کے برگ و بار سے اس قدر ملول خاطر بھی ہیں اور اس کے ساتھ ہی اسے علیٰ حالہ جاری بھی رکھے ہوئے ہیں۔ اس میں کسی تبدیلی کے لئے تیار نہیں۔

---

[1] اس درسگاہ کے لئے پہلا مرحلہ حصول اراضی کا تھا۔ دس سال کی تگ و تاز کے بعد یہ مرحلہ آخری منزل میں پہنچا تو ایک صاحب اقتدار کے دندان آز نے اس دبوچ لیا۔ تفصیل اس اجمال کی بڑی دلخراش ہے لیکن ہم اس وقت اس کے متعلق کچھ نہیں کہنا چاہتے کیونکہ مقدمہ ہائی کورٹ میں زیر سماعت ہے۔ اگر وہاں سے فیصلہ ہمارے حق میں بھی ہو گیا تو بھی یہ جو اتنا وقت ضائع ہو گیا ہے' اس کی تلافی کون کر سکے گا؟ ہمارے دور کی تاریخ میں یہ سانحہ بہرحال سیاہ حاشیوں کے اندر رقم کیا جائے گا۔ (طلوع اسلام)